برِّ صغیر ہند و پاکستان میں اسلامی تحریک کی تاریخ

(مولانا مسعود عالم صاحب ندوی)

[یہ وہ مقالہ ہے جو مولانا نے جماعت اسلامی پاکستان کے اجتماع عام منعقدہ کراچی میں پیش فرمایا تھا]

ہندوستان میں اسلام کی عام حالت | یوں تو ہندوستان پہلی صدی ہجری ہی میں اسلام کی روشنی سے منور ہو چکا تھا، اور یہ سرزمین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بابرکت قدموں سے بھی محروم نہیں رہی تھی، پر یہ بھی حقیقت ہے کہ آفتابِ اسلام کی پہلی کرنیں ساحلی علاقوں سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ عرب تاجر اور جہازراں، جو جنوب مغربی ساحل سے گزر کر سیلون اور جزائر شرق الہند کا رُخ کرتے تھے، ملک کے اندرونی علاقوں میں کم آتے۔ اسی طرح سندھ کا نامور فاتح محمد بن قاسم بھی اپنی مہم کو ادھورا چھوڑ کر واپس لوٹنے پر مجبور ہؤا۔ اس ملک اور خاص کر شمالی خطے کی بدنصیبی کہیے، کہ یہ عرب فاتحوں کے دم قدم سے محروم رہا، ان کی جگہ، اس کے حصے میں ایسے فاتح اور کشورکشا آئے، جو خود نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ یہ ترک اور مغل فاتح، اسلام بھی اس وقت لائے جب خود اس کے تہذیبی مرکزوں (حجاز، عراق، شام) میں انحطاط رونما ہو چکا تھا اور عباسی حکومت نومسلم غلاموں کے ہاتھوں میں بچوں کا کھلونا بن گئی تھی۔ یہ لوگ عام طور پر اسلام کے قانونِ جنگ سے ناواقف تھے اور ان کی فوج میں بڑی تعداد نومسلموں کی تھی۔ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے حالت اور بھی خراب تھی۔ محمود غزنوی سے پہلے اُن کے ہاں مدرسوں کا رواج ہی نہیں تھا اور یہی وجہ ہے کہ درۂ خیبر سے آنے والی اکثر قومیں اسلامی تعلیمات سے اکثر بے بہرہ رہیں۔ ان بادشاہوں اور کشورکشاؤں کے کارنامے ملک گیری اور جنگی صلاحیتوں کے لحاظ سے جو بھی قدر و قیمت رکھتے ہوں، مگر اسلامی تعلیم اور اسلامی نظامِ حکومت و عدل کے عملی مظاہرے کے اعتبار سے ان کی کوئی خاص قیمت نہیں۔ بلکہ تلخ بیانی معاف، ان بادشاہوں کی عملی زندگی اور ان کے سیاسی طرزِ عمل نے اسلام کے متعلق ایسی بے شمار غلط فہمیاں پیدا کر دیں، جو ایک مدت کی مسلسل اور

پیہم کوششوں کے باوجود آج تک دُور نہیں ہو سکی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس ملک کے بڑے خطّے کے حصے میں اسلام کے ایسے پیام بر آتے جو خود اسلام کی تعلیم سے اچھی طرح واقف نہ تھے، اور تھوڑی بہت واقفیت تھی بھی، تو اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق انہیں کم ہی میسّر ہوتی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ وہ دین جو ایک عقیدہ اور ہمہ گیر نظامِ زندگی کی حیثیت سے تمام ادیان اور نظامہائے حیات پر غالب ہونے کے لیے آیا تھا، ہندوستان پہنچ کر شرک اور جاہلیت کے انبار میں دب کے رہ گیا۔ حجاز سے توحید کا جو صاف و شفاف چشمہ رواں ہوا تھا، گنگا اور جمنا کی آمیزش نے اسے گدلا کر دیا، توحیدی عقائد شرک کی آلودگیوں میں لت پت ہو گئے، اور دینِ حق کا منضبط نظامِ زندگی جاہلیت کے طور طریقوں سے بُری طرح مسخ ہوا۔

ہم یہ جانتے ہیں، اور خود اس ملک کے غیر مسلموں نے بھی اسے مانا ہے، کہ اس سرزمین پر اسلام کے بڑے احسانات ہیں۔ لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس سرزمین میں اسلام پر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں اور یہاں اسلام قبول کرنے والوں نے اپنی کوتاہیوں کے باوجود جتنا کچھ بھی اسلام کا علم پیدا کیا اور جس قدر بھی، تھوڑا یا بہت، اس پر عمل کیا، اُس کی بدولت یہاں کے عقائد، اخلاق، تمدّن اور تہذیب میں بڑی اصلاحات رونما ہوئیں، تو اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ یہاں کے جو اثرات بیرونی مسلمانوں نے قبول کیے اور جو اثرات ملکی مسلمانوں میں باقی رہے، انہوں نے نہ صرف اسلامی نظامِ زندگی کو مسخ کیا بلکہ خود اسلام کے عقائد اور تصوّرات و نظریات تک میں غلط قسم کی آمیزشیں کر دیں۔ یہ وہ خرابی ہے جسے زمانہ گذشتہ میں ہر دور کے مصلحین نے محسوس کیا ہے اور اسے دُور کرنے کی کوشش کی ہے۔ خصوصاً حضرت مجدّد الف ثانیؒ (ف ۱۰۳۴ھ) کے عہد سے لے کر آج تک ساڑھے تین سو برس ہو چکے ہیں کہ اس کی اصلاح کی مسلسل کوششیں ہو رہی ہیں، مگر اس کے باوجود صدیوں کا یہ بیٹھا ہوا زنگ پوری طرح دُور نہیں ہو سکا۔

دسویں صدی ہجری سرزمینِ ہند میں اسلام کی یہ عام حالت تھی۔ کم و بیش ہر دور میں ہندوانہ اسلام

دل و دماغ پر چھایا رہا۔ مگر دسویں صدی ہجری سے پہلے کفر و شرک کی یہ تاریکی اپنی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ گجرات اور سندھ کے ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر، جن کے تعلقات عرب ملکوں سے قائم تھے، ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ تصوف کو اشراقی اور ویدانتی فلسفوں نے بگاڑ کر رکھ دیا تھا، ہر طرف بدعات کی گرم بازاری تھی۔ زندگی کا کوئی شعبہ مشرکانہ اثرات سے پاک نہیں رہا تھا۔

اس زبوں حالی کی بڑی وجہ کتاب و سنت کی تعلیم سے غفلت اور بے پروائی تھی۔ اس غفلت کا بڑا سبب یہ ہے کہ شمالی ہند میں دین کی طرح علم بھی ماوراءالنہر سے آیا۔ بعض اسباب کے تحت علمائے ماوراءالنہر کی علمی پرواز فقہ اور اصولِ فقہ سے آگے نہیں بڑھی۔ اس لیے شمالی ہند میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ فقہ و اصولِ فقہ تک محدود رہا، اور یہاں بھی فقہاء کے متون کو اصلِ دین کی سی اہمیت دی جانے لگی۔ قرآن و حدیث سے بے خبری کی صورت میں ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا۔ گجرات اور ساحلی علاقوں میں عرب ملکوں سے اہلِ علم کی آمد کا سلسلہ جاری تھا، اس لیے وہاں حَدَّثَنَا وَأَخْبَرَنَا کا غلغلہ بلند ہوتا رہا، مگر اس خوش نصیب علاقے میں بھی حدیث و سنت کی چہل پہل اسی وقت تک رہی جب تک شمالی ہند کا سایہ اس پر نہیں پڑا۔ بیچ کی دو صدیوں (۷۹۹ھ - ۹۸۰ھ) میں وہ مرکزی حکومت کے دباؤ سے محفوظ رہا اور علم و عمل کی خوب گرم بازاری رہی۔ جب اکبر (۹۶۴ - ۱۰۱۴ھ) نے گجرات کا صوبہ بھی اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تو وہاں بھی وہی جہل و تاریکی لوٹ آئی۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ شمالی ہند کے کان حدیث سے بالکل ناآشنا رہے۔ البتہ عرض یہ کرنا ہے کہ شیخ عبدالحق (ف ۱۰۵۲ھ)، بلکہ شاہ ولی اللہ دہلوی (ف ۱۱۷۶ھ) سے پہلے اس خطے میں حدیث کا عام چرچا نہیں ہوا۔ دسویں صدی ہجری سے پہلے شمالی ہند میں صرف ایک جلیل القدر محدث حسن (ف ۶۵۰ھ) کا نام ملتا ہے۔ پھر تین صدیوں کے بعد شیخ علی متقی (ف ۹۷۵ھ) مسند درس پر جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان دو ناموں اور ان کے کارناموں سے شمالی ہند کے اربابِ اقتدار اور اصحابِ علم کی کوتاہیوں کا کفارہ نہیں ہو سکتا۔

دسویں صدی ہجری تک اس برصغیر کی عام حالت یہی تھی۔ گو اللہ کی زمین نیک بندوں سے بالکل خالی بھی نہیں رہی۔ صلحائے امت انفرادی طور پر تبلیغ و دعوت کا کام کرتے رہے۔ بادشاہوں میں محمد تغلق (۷۲۵-۷۵۲ھ)، فیروز تغلق (۷۵۲-۷۹۰ھ)، اور سکندر لودی (۸۹۴-۹۲۳ھ) کے نام ملتے ہیں، جنہوں نے اپنی صوابدید اور ہمت کے مطابق صورت حال کے بدلنے کی کوشش کی لیکن دشواری یہ تھی کہ صحیح الفکر اہل علم کے فقدان، دین سے عام بےخبری اور خاص طور پر اسلام کے ملکی اور جنگی قانون سے پوری واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ بسا اوقات ایسے کام بھی کر جاتے تھے جن کی قانون شریعت کے اندر مشکل ہی سے گنجائش نکل سکتی ہے۔ بہرحال اس کے باوجود ہندوستان کی تاریخ میں ان نیک دل اور خدا ترس بادشاہوں کا ایک خاص مقام ہے جسے اسلامی تحریک کا مؤرخ کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔

دسویں صدی ہجری سے پہلے کی ان اصلاحی اور تبلیغی کوششوں میں علماء کا حصہ نمایاں نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح عالم دین بہت کم تھے، اور جو تھے اُن کا بھی بڑا حصہ اپنے فرائض سے بالکل غافل تھا۔ البتہ جیسا کہ ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے، کچھ باعمل اور خلوت نشین صوفی ضرور تھے جو اپنی اپنی جگہ دعوت و تبلیغ میں مصروف تھے۔ اور یہ ان ہی بزرگوں کی خاموش دعوت کا اثر ہے کہ اس ملک میں اسلام کی بو باس نظر آتی ہے۔ لیکن یہ خلوت نشین اور شب زندہ دار صوفی نہ ایسے ذرائع رکھتے تھے کہ یہاں کے عوام میں اسلام کا علم وسیع پیمانے پر پھیلا سکتے، اور نہ حکومت کی مدد کے بغیر یہی ممکن تھا کہ تنہا ان کی کوششوں سے مسلمانوں کی روز افزوں آبادی بدعات اور مشرکانہ عقائد اور جاہلیت کی رسموں سے محفوظ رہتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ان بزرگوں کے فیضِ نظر سے داخل اسلام ہوتے تھے، وہ خود ان ہی بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا بیٹھے۔ اور جہالت نے انہیں مرکزوں کو بدعات کی آماجگاہ بنا کر چھوڑا جہاں سے خلقِ خدا کو اسلام کی نعمت نصیب ہوئی تھی۔

دورِ ضلالت ۹۶۴ھ - ۱۰۱۴ھ | دسویں صدی ہجری اور اس سے پہلے جو مسلمان بادشاہ تخت

حکومت پر جلوہ افروز ہوتے وہ کم سے کم دین سے عناد نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ ان میں محمد تغلق اور فیروز تغلق جیسے صالح اور دردمند فرمانروا بھی ہوتے ہیں، جنہوں نے دین کی خدمت اور اصلاح حال کی اپنی سی کوشش میں کوتاہی نہیں کی۔ مُغلوں کا رنگ شروع ہی سے بدلا ہوا تھا۔ خود تیمور نے قتل و غارت میں مسلمان اور کافر کے درمیان کوئی تمیز نہیں کی۔ ہمایوں اپنی پریشاں حالی اور سرگشتگی کے بعد ایران سے واپس آیا تو ایسا تحفہ لے کر، جو بعد میں اسلامی ہند کا ایک پیچیدہ اور مستقل مسئلہ بن گیا۔ لیکن جس مغل بادشاہ کے دور میں اسلام اور مسلمانوں پر زمین تنگ کرنے کی کوشش کی گئی اور دین و شعائر دین کی بے حرمتی میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا گیا، وہ اکبر ہے

یہ نو عمر اور ان پڑھ بادشاہ ۹۶۴ھ میں تخت و تاج کا وارث ہوا اور اس نے پورے پچاس برس حکومت کی۔ اس کے کان میں کسی شیطان نے پھونک دیا کہ "اب نبی عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کو ہزار سال ہو رہے ہیں، دوسرے ہزار میں نئے دین اور نئے مذہب کی ضرورت ہے۔ وہ پرانا دین اب کام نہیں دے سکتا" جادو کام کر گیا اور گم کردہ راہ مصاحبوں اور درباریوں کی سازش سے ایک نئے مذہب (دین الٰہی) کی داغ بیل پڑنا شروع ہو گئی۔ بادشاہ کی خدمت میں ایک محضر نامہ پیش کیا گیا (۹۸۷ھ) جس کا مضمون یہ تھا کہ "بادشاہ ظل اللہ ہے۔ امام عادل ہے مجتہد العصر ہے کسی کا پابند نہیں۔ اس کا حکم سب پر بالا ہے"۔ خلاصہ یہ کہ اسے معصومیت کی سند دے دی گئی اور وہ آئے دن دین میں من مانی ایجادات کرنے لگا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ اس نے شیعہ مذہب بھی اختیار کیا تھا اور سُنّی علماء پر بڑی سختیاں کی تھیں بعض کہتے ہیں کہ وہ تصوف کی طرف مائل تھا۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ ہم اسے مذہب کے باب میں خبطی کہہ سکتے ہیں۔ آفتاب اور آگ کے سامنے سر عقیدت خم کرنا بھی اس سے منقول ہے۔ حضرت مریم کو معبود بنانا اور ستاروں کی پرستش بھی اس کی طرف منسوب ہے۔ اور تو اور اپنی عقل کو بھی وہ معصوم سمجھنے لگا تھا۔

اس خبط اور دماغی عدم توازن کے ساتھ اسلام اور شعائر اسلام سے اس کی نفرت بھی حد سے

زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ ملازموں کو دھمد اور داحمد کے ناموں سے پکارا گیا تاکہ دخاکم بدہن احترام نبوت کی تخفیف ہو ہجری تقویم کے بدلے "الٰہی تقویم" جاری کی جس کا آغاز اس کی تخت نشینی کے سال سے کیا گیا۔ شراب اور قمار بازی کے کھلم کھلا مباح کرنے کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ گاؤ کشی بالکل بند کر دی گئی۔ مسجدیں بھی منہدم کی گئیں ۔۔۔ دوسری طرف غیر مسلم بیویوں کی وجہ سے قصرِ شاہی میں ہندو تہذیب و معاشرت کا سکہ چلنے لگا۔ ان کے لیے قصر میں خاص عبادت خانے بنائے گئے۔ بتوں کی پوجا کا باقاعدہ انتظام تھا۔ ہندو تہواروں کے موقع پر عام عید منائی جاتی مختصر یہ کہ سارا ماحول ہندوانہ ہو گیا۔

فتنۂ اکبری کی تفصیل کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ اس مختصر تحریر میں سرسری اشارے ہی کیے جا سکتے ہیں۔ البتہ ایک چیز رہی جاتی ہے جس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ دورِ اکبری کی اس گمراہی اور کج روی کا بڑا سبب "علماء سوء" ہیں۔ ان کی باہمی رقابت، مال و متاعِ دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی طلب، اور اس پر دین کے سطحی علم نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ یہ ان علماء سوء کی پست ہمتی، بزدلی اور دنیا طلبی ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ایک ایسے محضر نامہ پر دستخط کر دیے، جو حقیقت میں دین و مذہب کا "قتل نامہ" تھا۔ اس لیے یہ عرض کرنا بے جا نہ ہو گا کہ اس فتنہ کی پرورش و پرداخت میں علماء سوء کا بڑا حصہ تھا۔

دورِ اکبری کے ابن حنبل، حضرت مجدد الف ثانیؒ بالکل بجا ارشاد فرماتے ہیں:۔

"ہر فتورے کہ دریں زمان در ترویج ملت و دین ظاہر گشتہ از شومیٔ علماء سوء است کہ فی الحقیقت شرار مردم و لصوص دین اند۔ أُولٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ۔ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ"

مجدد الف ثانیؒ ۹۷۱ - ۱۰۳۴ھ اب ہم ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے اس موڑ پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے صحیح اسلامی رہنمائی شروع ہوتی ہے۔ زمین تپتی ہے تو بارانِ رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ جب اکبری دور کی فتنہ سامانیاں حد سے بڑھ گئیں اور سچے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہونے لگا، تو قدرت نے ایک درویش کو خلعتِ تجدید عطا فرمایا، جس نے دیوتاؤں کی اس سرزمین میں پہلی مرتبہ صحیح اسلامی رہنمائی کا علم بلند کیا، کفر و شرک کی اندھیاری میں کتاب و سنت کی شمع روشن کی، توحید

خالص کا بول بالا کیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "افضل الجہاد" کی سنت زندہ کی ــــــــــ آپ سمجھے! یہ درویش کون تھا؟ احمد بن عبدالاحد فاروقی سرہندی، مجدد الف ثانیؒ۔ اُن کی ہڈیاں پھولوں میں رہیں! سچ یہ ہے کہ وہ مجدد کہے جانے کے مستحق ہیں۔ حسین بن علیؓ احمد بن حنبلؒ اور ابن تیمیہؒ نے اپنے اپنے زمانوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے تھے، وہی خدمت اس بوریا نشین درویش نے انجام دی اور اُسی شانِ استغناء و محبوبیت کے ساتھ جو ازل سے مقربین بارگاہ کا خاصہ رہا ہے۔

مجدد صاحبؒ کی نشوونما دسویں صدی ہجری کے اواخر میں ہوئی۔ وہ سنِ رشد کو پہنچتے ہی اس فتنے کے عواقب کو بھانپ گئے اور اس کے مقابلے کے لیے تیاری شروع کر دی۔ دور و نزدیک ہر طرف مریدوں کا جال پھیلا دیا۔ حکومت کے افسروں اور فوج کے سپہ سالاروں پر تبلیغ شروع کر دی لیکن ان کی دعوت کے اثرات جہانگیر کے عہد حکومت میں ظاہر ہوئے، جبکہ یہ فتنہ پورے شباب پر تھا۔ اس وقت وہ کھل کر میدان میں آ گئے۔ منکرات و بدعات کی بیخ کنی میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ بے شمار خلق خدا آپ کے ہاتھوں ہدایت پذیر ہوئی۔ اوّل اوّل تو حکومت نے سختی نہ کی، مگر جب کلمۂ حق واشگاف بلند ہوا تو جبینِ اقتدار پر شکن آ گئی۔ دربار میں طلبی ہوئی۔ مجاہد نے وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا۔ انسان، انسان کو سجدہ کرے، ایک موحد یہ کس طرح برداشت کر سکتا ہے؟ حضرت مجدد نے سرِ دربار اِن بدعات و منکرات کی مذمت کی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیئے گئے۔ مگر مردِ حق آگاہ وہاں بھی اپنے کام میں مشغول رہا۔ دیکھتے دیکھتے قید خانہ کی کایا پلٹ ہو گئی۔ تب حکومت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بادشاہ نے دعوت دی۔ ولی عہد نے استقبال کیا۔ وقت کے مصلح و مجدد نے ان موقعوں سے پورا فائدہ اٹھایا اور دورِ اکبری کی منکرات و بدعات کی منسوخی عمل میں آ گئی اور تقریباً نصف صدی کی گھٹا ٹوپ تاریکی کے بعد ایک مرتبہ پھر اس ملک میں اسلام کو سربلندی حاصل ہوئی۔

مجدد صاحبؒ نے جن چیزوں کی طرف خاص توجہ کی، وہ یہ ہیں:۔

(۱) سب سے پہلے ارکانِ حکومت کی اصلاح کی طرف توجہ کی کہ ان کے دلوں میں دعوت جگہ پیدا کرے تو

پھر پوری قوم کا مائل ہو جانا دشوار نہیں۔ اور اس میں انہیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔

(۲) انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام پر اس دور میں جو مصیبتیں آئی ہیں اور آرہی ہیں ان میں علماء سوء کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا بڑا دخل ہے۔ اس لیے انہوں نے ان کی پردہ دری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اور اس کے مفید نتائج ظاہر ہوئے۔

(۳) اسی طرح انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے زمانے کے صوفیہ اکثر و بیشتر ویدانت کے فلسفے اور ہندو جوگیوں کی ریاضتوں سے متاثر ہیں، اور ان کی بڑی تعداد "وحدۃ الوجود" اور "ہمہ اوست" جیسے مشرکانہ عقائد کی قائل ہو گئی ہے۔ حضرت مجددؒ نے ان جاہل صوفیوں اور ان کے گمراہ کن عقائد اور خاص کر وحدۃ الوجود کی کھلم کھلا اور بے لاگ تردید کی۔ اور یہ ان کا ایسا کارنامہ ہے جو اسلامی ہند کے فکری ارتقاء میں انہیں ایک خاص مقام عطا کرتا ہے۔

(۴) عرصہ دراز سے جاہل واعظوں اور خوش عقیدہ مشائخ کا یہ شیوہ رہا ہے کہ جہاں انہیں کسی بدعت پر ٹوکا گیا، وہ بدعت حسنہ کی آڑ لے کر سامنے آگئے۔ مجدد صاحبؒ نے شاید اسلامی ہند میں پہلی مرتبہ اس کا پردہ چاک کیا۔ انہوں نے اپنے مکتوبات میں واشگاف طریقہ پر بار بار بیان کیا ہے کہ بدعت بدعت ہے اور اس لیے ضلالت بھی۔ اس میں حسنہ اور سیئہ کا کیا سوال؛ لَیْتَ شِعْرِیْ مِنْ اَیْنَ حَکَمُوْا بِحُسْنِ الْبِدْعَةِ الْمُحْدَثَةِ فِی الدِّیْنِ الْکَامِلِ۔ مجدد الف ثانیؒ کا یہ کارنامہ بھی کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ خصوصیت کے ساتھ یہ دیکھ کر مجدد صاحبؒ کے اس "کارنامے" کی وقعت اور بڑھ جاتی ہے کہ "بدعت حسنہ" کے سلسلے میں بڑے بڑے علماء نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ وحدۃ الوجود کی بے لاگ تردید اور بدعتِ حسنہ کی پردہ دری، مجدد صاحبؒ کے یہ ایسے شاندار کارنامے ہیں، جو نہ صرف اسلامی ہند بلکہ پوری اسلامی فکر کی تاریخ میں انہیں خاص مقام عطا کرتے ہیں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

شیخ عبدالحق دہلویؒ ۹۵۸ھ - ۱۰۵۲ھ

مجدد صاحبؒ کے تجدیدی کارناموں کے ساتھ ان کے صاحبِ علم معاصر شیخ عبدالحقؒ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ ان کی ذات سے شمالی ہند میں علم حدیث

کو زندگی ملی، اور سنت نبوی کا عام چرچا ہوا۔ ہمارے نزدیک حدیث نبوی کی خدمت و مزاولت خود بخود دین کی روح اور مزاج سے قریب کرتی ہے۔ شیخ عبدالحق نے اپنی عمر کا بڑا حصہ حدیث و سنت کی خدمت میں صرف کیا اور اس کا خزانہ عام کر دیا۔ ہم ان کا یہ احسان فراموش نہیں کر سکتے اور آج ان کی علمی و دینی خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں۔

اورنگ زیب ۱۰۶۸ - ۱۱۱۸ھ اگو جہانگیر (ف ۱۰۳۷ھ) کے آخر دورِ حکومت ہی سے مغلیہ حکومت کی پالیسی بدلنا شروع ہو گئی تھی، اور شاہ جہاں (۱۰۳۷-۱۰۶۸ھ) کے دور میں تبدیلی نمایاں ہو گئی۔ تمدن و تہذیب کا سانچہ بدلنے لگا۔ دربار کے آداب و اطوار میں فرق آیا ـــ مگر اکبر اور اس کے درباری سالہا سال تک جس فتنۂ خبیثہ کی پرورش کرتے رہے اور ان کی پھیلائی ہوئی اخلاقی بیماریاں جس طرح سوسائٹی کے رگ و پے میں سرایت کرتی رہیں۔ ان کے دفعیہ اور بیخ کنی کے لیے ایک صاحب عزم اور اولوالعزم فرماں روا کی ضرورت باقی تھی، جو الحمدللہ کہ بوریا نشین اور گلیم پوش سلطان، عالمگیر اورنگ زیب کی تخت نشینی سے پوری ہو گئی۔ اس کی تخت نشینی کیا تھی؟ ایک مسلسل جہاد کا عزم، ایک نہ ختم ہونے والی جدوجہد کا آغاز! داراشکوہ اور اورنگ زیب کی جنگ صرف دو بھائیوں کی لڑائی نہ تھی۔ حقیقت میں یہ دو مختلف مکاتیب خیال کی جنگ تھی۔ ایک اپنے پردادا کی سنت زندہ کرنا چاہتا تھا اور دوسرا اپنے پیغمبر اور ہادی کی سنت۔ سچی بات یہ ہے کہ اسلامی ہند کی کوئی تاریخ اس بوریا نشین بادشاہ کے کارناموں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ تغلق خاندان کے بعض فرمانرواؤں کو چھوڑ کر یہ پہلا اور آخری بادشاہ تھا جس نے بتوں کی اس سرزمین میں دینِ حق کی بنیادیں مضبوط کیں۔ کفر و شرک کی آلودگیوں سے اس کا دامن پاک کیا۔ حکومت اور نظم مملکت کے تمام شعبوں میں اسلامی آئین کی برتری قائم کرنے کی کوشش کی۔

اس موقع پر اُس نظامِ حکومت کے متعلق بھی دو حرف عرض کر دینا شاید بے محل نہ ہو جو ہندوستان کے مسلم عہد میں قائم تھا۔ ظاہر ہے کہ ان مسلمان حکومتوں میں موروثی بادشاہی کا سکہ ہی چلتا تھا جہاں فردِ واحد کو ہست و نیست کے سارے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اس

پہلو سے یہ لوگ بھی ایک غیر اسلامی نظامِ حکومت میں بادشاہی کے منصب پر فائز تھے دوسری طرف اُن کی ذاتی خدا ترسی، تقویٰ اور احساس ذمہ داری، انہیں کسی غیر اسلامی فعل سے روکتی اور قانون شریعت کے اجراء و نفاذ پر آمادہ کرتی رہتی تھیں۔ اس طرح پر ان نیک بندوں نے اس نظام کے اندر رہتے ہوئے گویا دو متناقض چیزوں کے درمیان سمجھوتہ کی کوشش کی۔ اس میں یہ کہاں تک کامیاب ہوئے، تاریخ کے صفحات اس کا جواب دیں گے۔ اسلامی تحریک کی تاریخ میں بہر حال ان کا ایک مقام ہے۔ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ ۱۱۱۴ - ۱۱۷۶ھ | اب ہم بارھویں صدی کے حدود میں داخل ہو رہے ہیں۔ اورنگ زیب کی وفات ۱۱۱۸ھ میں ہوئی۔ وہ جسے ہندوستان میں "ناموس ملت کا آخری پاسبان" کہا جاتا ہے۔ اس کے جانشین ایسے کمزور اور بودے ثابت ہوئے کہ نصف صدی کے اندر اندر دیکھتے دیکھتے مغلیہ حکومت کا اقتدار جاتا رہا۔ نظم و نسق حکومت میں بالکل ابتری پیدا ہوگئی۔ ہر طرف بغاوت اور خود مختاری کا جھنڈا بلند ہونے لگا۔ مختلف صوبوں میں مقامی سیاسی طاقتیں سر اٹھانے لگیں۔ پھر ان سیاسی طاقتوں کے ساتھ مقامی تہذیبوں نے بھی بال و پر نکالنا شروع کیے۔ اور وہ سب بدعات اور ہندوانہ رسوم جو اورنگ زیب کی کوششوں سے دب گئے تھے، از سر نو منظر عام پر آنے لگے۔ شیعیت بھی آخری کمزور بادشاہوں کی سرپرستی میں پھر سر چڑھنے لگی۔ عام مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف نہ پہلے توجہ کی گئی اور نہ اب۔ پوری قوم حکومت و امرائے حکومت کے سہارے جیتی رہی۔ جوں ہی حکومت کمزور ہوتی نظر آئی، ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ علماء اور صوفیہ کی روش میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں پیدا ہوئی۔ مدرسوں کا نظامِ تعلیم اسی پرانے ڈگر پر چلتا رہا۔ کتاب و سنت سے بے پروائی اپنے حال پر قائم رہی۔ خلاصہ یہ کہ ایک طرف چھ سات سو برس کی رچی بسی ہوئی خرابیاں تھیں۔ دوسری طرف ایک فقیر، اور ایک شہنشاہ کی کوششیں۔ اگر اورنگ زیب کے جانشین جاندار اور ہوشمند ہوتے تو شاید اصلاح و تجدید کا یہ ارتقاء جاری رہتا۔ مگر ان کی کمزوری اور نااہلی نے نقشہ ہی بدل دیا۔ حالات

بد سے بدتر ہو گئے اور پھر ایک مصلح و مجدد کی شدت سے ضرورت محسوس ہونے لگی۔

ان حالات اور اس ماحول میں شاہ ولی اللہؒ نے آنکھیں کھولیں اور سنِ رُشد کو پہنچتے ہی از سرِ نو اصلاح و تجدید کا بیڑا اٹھایا۔ ان کے سامنے مکمل دین تھا اور اسے تمام پہلوؤں سے اُجاگر کرنا چاہتے تھے۔ پوری اسلامی تاریخ کا جائزہ اور غیر اسلامی افکار کی تنقیح و تنقید بھی ان کے مشن کے اہم اجزاء تھے۔ اس عظیم الشان کام کے لیے جس علم اور عزم و ہمت کی ضرورت تھی، وہ انہیں پوری طرح حاصل تھی۔ ہم ان کے کارناموں کو حسب ذیل موٹی موٹی قسموں میں بیان کر سکتے ہیں:۔

(۱) ہمایوں کے زمانے ہی سے شیعیت کا زور شروع ہو گیا تھا اور دن بدن بڑھتا ہی رہا۔ شاہ صاحبؒ نے "ازالۃ الخفا" لکھ کر عملی طور پر یہ حجت تمام کر دی، نیز اسلامی حکومت کی خصوصیات اُجاگر کیں۔

(۲) اب تک علماء علمِ کلام ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے انہیں حدیث و فقہ کی طرف توجہ دلائی اور اسرارِ شریعت پر "حجۃ اللہ البالغہ" لکھ کر ان کے خیالات کی تصحیح کی۔

(۳) بارھویں صدی ہجری سے پہلے ہندوستان کے علمی و دینی حلقوں میں قرآن کریم کی تعلیم گویا نصاب سے خارج تھی۔ انہوں نے اصولِ تفسیر میں ایک گراں قدر کتاب "الفوز الکبیر" لکھ کر کتاب اللہ کے درس و مطالعہ کی دعوت دی۔ ساتھ ساتھ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کر کے عام لوگوں کے لیے قرآن پڑھنے اور سمجھنے کی راہ کھول دی۔

(۴) تقلید جامد کے خلاف آواز بلند کی اور تحقیق و اجتہاد کے عملی نمونے پیش کیے۔ نیز مجتہدین کے باہمی اختلافات پر روشنی ڈالی اور ائمہ کے مختلف فیہ اقوال کے درمیان تطبیق کی کوشش کی۔ حجۃ اللہ البالغہ اور الانصاف میں اس باب کے خاص مباحث ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے ذہن خود بخود کتاب و سنت کی طرف مائل ہوتا ہے اور طبیعت تقلید جامد سے اِبا کرتی ہے۔

(۵) حدیث نبوی کا خزانہ عام کرنے میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ صرف کیا۔ مؤطا امام مالکؒ

کی عربی و فارسی میں دو شرحیں لکھیں، اور دوسری چھوٹی تصنیفات کے علاوہ اپنے پیچھے شاگردوں کا ایک ایسا سلسلہ چھوڑ گئے جن کے فیضِ علم سے ہندوستان کا چپہ چپہ "حَدَّثَنَا" اور "اَخْبَرَنَا" کے ہمہموں سے گونج اٹھا۔

صاحبزادے اور شاگرد شاہ صاحبؒ کی خوش نصیبی سے اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے باکمال فرزند اور شاگرد عطا فرمائے، جو ان کے بعد، ان کے مشن کی تکمیل میں لگے رہے اور پھر انہی کی تعلیم سے متاثر ہو کر اور انہی کے خاندان میں وہ سرفروش مجاہد بھی پیدا ہوئے جنہوں نے شہادت حق کی راہ میں اپنے جان و تن کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ان کے چاروں صاحبزادے، شاہ عبدالعزیزؒ (ف ۱۲۳۹ھ)، شاہ رفیع الدینؒ (ف ۱۲۳۳ھ)، شاہ عبدالقادرؒ (ف ۱۲۳۰ھ) اور شاہ عبدالغنیؒ (ف ۱۲۲۷ھ) سب کے سب یگانۂ روزگار اور مرجع خواص و عوام تھے۔ ان کے دم سے ہندوستان میں کتاب و سنت کا چرچا ہوا۔ ان کی تصنیفات اب تک علماء اور طلبہ کا مرجع و ماخذ ہیں۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا ترجمۂ قرآن آج تک معیاری اور اپنی آپ مثال ہے۔ اسی طرح ان کے نواسے شاہ محمد اسحٰقؒ (ف ۱۲۶۲ھ) نے بھی ایک مدت تک مسند ولی اللّٰہی کی روایات قائم رکھیں اور ان کے چشمۂ علم سے عرب و عجم کے ہزاروں افراد سیراب ہوئے۔ شاہ صاحبؒ کے صاحبزادوں میں صرف چھوٹے بیٹے شاہ عبدالغنیؒ نوعمری ہی میں وفات پا گئے۔ اور اس لیے انہیں اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح کام کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ لیکن قدرت کے انداز نرالے ہیں۔ اُن کے صُلب سے وہ یگانۂ روزگار مجاہد پیدا ہوا جس نے دادا کے ادھورے کام کی تکمیل کی اور اسلامی ہند کی تاریخ پر ایسا نشان چھوڑ گیا جو رہتی دنیا تک مٹ نہیں سکتا۔ آگے کی سطروں میں ان کے کارناموں کی طرف ضروری اشارے کرتے ہیں۔

شہیدؒ اب تو یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلامی ہند میں اصلاح و تجدید کی ابتدا حضرت مجدد سرہندیؒ سے ہوئی۔ شاہ صاحبؒ نے ان سے آگے بڑھ کر ایک مکمل فکری و علمی تجدید و انقلاب کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن خود وہ انقلاب برپا نہ کر سکے۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ ذہنوں کی صفائی اور افکار و نظریات کی تنقیح و تنقید میں بسر ہوا۔ یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ قوموں کی تاریخ میں ایسا ہوتا آیا ہے۔

شاہ صاحبؒ کی وفات کو زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ ان سے تعلق رکھنے والوں اور خود ان اہی کے خاندان میں، ایسے اللہ کے بندے نکل آتے جنہوں نے ان کے مشن کی تکمیل کی۔ دعوت حق کا پرچم بلند کیا اور اس سرزمین میں پہلی مرتبہ اقامتِ دین کی تحریک برپا کی۔ میری مراد سیّد شہید بریلویؒ (۱۲۰۱-۱۲۴۶ھ) اور ان کے جاں نثار رفیق مولانا اسماعیل شہیدؒ (۱۱۹۳-۱۲۴۶ھ) سے ہے۔ حق یہ ہے کہ ان شہیدانِ راہِ حق اور ان کے ماننے والوں اور ان کے نقشِ قدم پر گھر بار لٹانے والوں نے اس ملک میں ایک بار عہدِ صحابہؓ کی یاد تازہ کر دی۔ ان کا مقصد اللہ کے دین کو غالب کرنا اور اس کی شریعت کو اس کی زمین پر نافذ کرنا تھا۔ اور اس مقصدِ عظیم کے لیے انہوں نے ہر ممکن قربانی کی۔ بنگال سے لے کر سرحد اور ماورائے سرحد تک، زمین کا چپہ چپہ ان کی قربانیوں اور فداکاریوں پر گواہ ہے۔ چرخ کج رفتار ان شہیدانِ راہِ حق کے کارناموں کو بھلانا بھی چاہے تو کیسے بھلائے؟

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اس تحریکِ تجدید و جہاد کے بارے میں اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ یہ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک تھی جو صحیح اسلامی نصب العین کو سامنے رکھ کر شروع کی گئی اور آخر دم تک اپنے مقصد پر قائم رہی۔ اس کی برکت اور اس کے علم برداروں کے دم قدم سے توحید و سنت کا جو بول بالا ہوا اور بدعات و مشرکانہ رسوم کا جس طرح استیصال ہوا، اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ آج اس برصغیر ہند و پاکستان میں ایمان و عمل کی جو بُری بھلی متاع پائی جاتی ہے وہ انہی مردانِ حق کا فیض ہے اور انہی کے آفتابِ علم و عمل کا پرتو۔

یہ خیال صحیح نہیں کہ مشہدِ بالاکوٹ کے بعد یہ تحریک ختم ہو گئی۔ اور اب تو یہ کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں کہ سیّد صاحبؒ کی شہادت، یعنی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک سیّد شہیدؒ کے ماننے والے اور اس تحریک سے وابستگی رکھنے والے پوری طرح سرگرم عمل رہے۔ اور برطانوی پولیس اور فوج کی تمام چنگیز سامانیوں کے باوجود اپنا فرض انجام دیتے رہے۔

۱۸۵۷ء ابھی سید صاحبؒ کی تحریک ملک کے اندر اور باہر منظم طریقہ پر جاری تھی کہ ۱۸۵۷ء کا وہ خونیں انقلاب رونما ہوا، جس نے اس ملک کی کایا ہی پلٹ دی۔ مسلمان اس مہم میں آگے آگے تھے اور حکومت انہی کے ہاتھوں سے گئی تھی، اس لیے وہی اس انقلاب کا خاص طور پر شکار ہوئے۔ بدیسی حاکموں نے انہیں سیاسی اور معاشی طور پر ختم کرنے کا تہیہ کر لیا اور طرح طرح کی آزمائشوں اور مشکلات میں ڈال کر ان کا وجود و عدم برابر کرنے کی کوشش کی۔

دینی حیثیت سے بھی اس انقلاب کے نتائج کم خطرناک نہیں ثابت ہوئے۔ وہ قوم، جو ہمیشہ حکومتوں کے سہارے جیتی رہی اور جس کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا کبھی کوئی باقاعدہ انتظام نہیں کیا گیا، اور جس کے ذمہ دار اور مرفہ الحال طبقے کی بنیادی کمزوریاں پچھلی صدی کی کشمکش میں پوری طرح ظاہر ہو چکی تھیں۔ اس سے یہ توقع ہی کب تھی، کہ وہ انقلاب اور اس کے خطرناک نتائج کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے گی؟ نتیجہ ظاہر تھا۔ ایک افراتفری پیدا ہوئی۔ ایک طرف سے "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" کا نعرہ بلند ہوا۔ فرنگیت نوازی کا یہ نعرہ زندگی کے کسی ایک شعبے تک محدود نہیں رہا۔ تعلیم و تربیت سے لے کر مذہب و اخلاق تک سب اس کی لپیٹ میں آگئے۔ ہمیں یہاں خاص طور پر دینی افکار سے بحث ہے۔ سرسید اور اس کے ہمنواؤں نے اس سلسلے میں جو غلطیاں کیں، آج تک ان کی تلافی نہیں ہو سکی۔ سیاسی مرعوبیت نے ان کے دل و دماغ ماؤف کر دیئے تھے۔ وہ ہر چیز کو مفتوحانہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ان کی تبلیغ و تحریر سے دین کے باب میں ایک شکست خوردہ ذہنیت پیدا ہوئی، جس کے اثرات کسی نہ کسی حد تک ایک محدود طبقے میں اب بھی باقی ہیں۔

سید احمد خاں نے اپنے مشن کی تکمیل کے لیے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کی بنیاد رکھی، اور دوسری طرف اس شکست خوردہ ذہنیت کے ردعمل کے طور پر دیوبند کی درس گاہ قائم ہوئی۔ علی گڑھ اور دیوبند میں صرف دو درسگاہوں کی بنیادیں نہیں رکھی گئیں، بلکہ دو متضاد اور مختلف مکاتب فکر کے مستقل مرکز قائم ہوئے۔ ایک نے مسلمانوں کو علوم جدیدہ سے آگاہ کر کے اگر ایک مفید کام کیا، تو اس کے ساتھ ان کو مغرب کی ذہنی غلامی اور عملی تقلید کا روگ بھی لگا دیا۔ دوسرے نے مسلمانوں کی

علمی اور دینی میراث کو بچا کر اگر ایک اہم خدمت انجام دی، تو اس کے ساتھ وہ مسلمانوں کے موروثی جمود کو بھی برقرار رکھنے کا مرتکب ہوا، اور اس نے دنیا اور زمانے کی ضروریات سے گویا آنکھیں بند کر لیں۔ یہ کشمکش صرف دیوبند اور علی گڑھ، دو مقامات تک ہی محدود نہیں رہی، بلکہ جہاں کہیں بھی نئے اسکول اور کالج قائم ہوئے، انہوں نے سرسید کی پالیسی کو اپنی مشعلِ راہ بنایا، اور اسی طرح ملک کے جس حصے میں بھی کوئی مدرسہ قائم ہوا، عام جمود اور مسائل حیات سے فرار کی پالیسی میں اس کی روش دیوبند ہی کے نقشِ قدم پر رہی۔

یہ کشمکش عرصہ تک چلتی رہی، تا آنکہ دونوں قسم کی درس گاہوں سے ایک بڑی تعداد لکھ پڑھ کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی، اور اہل فکر و نظر کو احساس ہوا کہ اگر اس خلیج کو پاٹنے کی فوری کوشش نہ کی گئی، تو اسلامی ہند بالکل دو متضاد اور مخالف کیمپوں میں تقسیم ہو کر رہ جائے گا اور کسی متحدہ جدوجہد کے شروع کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں گی۔

اس احساس نے ندوۃ العلماء کی شکل اختیار کی۔ لکھنؤ میں اس کا دارالعلوم قائم ہوا، اور نصابِ تعلیم میں ایسی تبدیلیاں کی گئیں کہ طالب علم علوم دین اور عربی زبان و ادب میں مہارت کے ساتھ ساتھ دنیا اور اس کے مسائل سے بھی بے خبر نہ رہے۔ آگے چل کر اس نے دیوبند اور علی گڑھ کی انتہا پسندیوں کے درمیان ایک بین بین مسلکِ اعتدال کی شکل اختیار کر لی۔ اور ملک کے طول و عرض میں ایسی درس گاہیں قائم ہوئیں جو اس کے طریقۂ تعلیم و اصلاح سے متاثر تھیں، اور ایسے اہل علم و اہل قلم تو شمار میں نہیں آ سکتے، جو اس کے لٹریچر سے متاثر، فکری اور ذہنی طور پر اس سے قریب اور اس کے تہذیبی رجحان سے ہم آہنگ کہے جا سکتے ہیں۔ ندوہ کی ایک اور خصوصیت ہے ـــ ایک زندہ زبان کی حیثیت سے عربی زبان و ادب کی اہمیت پر زور دے کر اس نے عرب ملکوں سے اپنے تعلقات استوار کیے اور اس کے فارغ التحصیل طلبہ نے ان ملکوں کے مسائل سے ماہرانہ واقفیت بہم پہنچائی اور اپنے ملک کے حالات و مسائل سے ان ملکوں کو روشناس کرایا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ پچھلے دور میں جب کبھی اسلامی ہند کو دنیائے اسلام اور خاص کر عرب ملکوں سے رشتۂ الفت استوار

کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے، اسی درسگاہ کے تربیت یافتہ کام آتے ہیں، اور آئندہ بھی غالباً یہی اس کام میں آگے ہوں۔

نئے مُفکِّرین | یہ تین مکاتبِ فکر بیسویں صدی کے ابتدائی حصّے تک یہاں پوری طرح پھیلے رہے۔ اُدھر مسلمان ملکوں میں بے چینی اور اضطراب کی لہر دوڑنے لگی۔ سید جمال الدینؒ افغانی انتقال کر چکے تھے (ف ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء)۔ لیکن ان کے افکار و خیالات زندہ تھے۔ سلطان عبدالحمید معزول ہو چکا تھا۔ مگر اس کے ان تھک پروپیگنڈے کے اثر سے مسلمانانِ عالم کو عثمانی حکومت سے خاصی وابستگی ہو گئی تھی۔ ترکی انقلاب کے بعد ہی طرابلس اور بلقان میں جنگ اور بغاوت کے شعلے بھڑک اُٹھے اور پھر پہلی جنگِ عظیم کے شروع ہوتے ہوتے مسلمانانِ ہند کی محبوب ترکی حکومت برطانیہ و فرانس اور روس کے خلاف میدانِ جنگ میں کود پڑی۔

ان بین الاقوامی حالات کا ہندوستان میں اسلامی فکر کی نشو و نما اور ارتقاء پر گہرا اثر پڑا۔ ۵۷ء کے بعد پہلی مرتبہ مسلمانوں میں جاندار سیاسی تحریکیں اُٹھیں۔ قدرتی طور پر نئے رجحانات کی قیادت اور نئے افکار کی تربیت و پرورش کے لیے دو نئے مفکر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ ایک نے نثر کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور دوسرے نے نظم کو۔ ایک نے کتاب و سنّت کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔ دوسرے نے اسلام کی باطنی روح کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی، میری مراد ابو الکلام اور اقبالؒ سے ہے۔ ابو الکلام کا یہ دَورِ دعوت و جہاد ۱۳ء سے ۲۰ء، بلکہ اس کے کچھ بعد تک قائم رہا۔ اور اس دوران میں اُن کے خطبوں اور مقالات سے ہزاروں اور لاکھوں آدمی نہ صرف متاثر ہوئے، بلکہ اُن کی زندگیاں بدل گئیں، ان کے سوچنے اور سمجھنے کے سانچے تبدیل ہو گئے۔ مگر آہ! کہ جس نے اپنی غیر معمولی شخصیت اور معجز نما تحریر و تقریر سے لاکھوں نیند کے ماتوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا، اور ہزاروں دلوں میں ایمان کی تخم ریزی کی، آہستہ آہستہ خود فکر و عمل کے اس مقام پر پہنچ گیا، جہاں مخلص سے مخلص عقیدت مند کے لیے بھی اس کے قول و فعل کی توجیہ مشکل ہو گئی۔

اس کے برخلاف اقبالؒ کی روش یکساں اور ان کا فکری ارتقا مسلسل جاری رہا۔ ۱۹۰۸ء میں یورپ سے جو فکر و نظریے کر وہ آئے تھے، اس میں برابر جلا ہوتی رہی، اور حلقۂ فیض و استفادہ بڑھتا ہی گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں اقبالؒ کے فکر و نظر اور ان کی تصنیفات سے اسلامی فکر کی تشکیل و پرداخت میں بڑی مدد ملی ہے۔ اور اپنی عمر کے آخری سالوں میں "قادیانیت" کے خلاف ان کا جہاد تو اسلامی ہند کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

سیاسی تحریکوں کا اثر | طرابلس و بلقان کے ...رح فرسا حادثات سے لے کر تحریک خلافت تک مسلمانانِ ہند میں جو سیاسی بیداری اور فداکاری کا جذبہ پیدا ہوا، اس کا بھی اسلامی فکر و تحریک پر اچھا اثر پڑا۔ ان تحریکوں میں جو لوگ آئے، وہ قلب و جسم ہر لحاظ سے مسلمان ہو کر آئے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا اور سوچنے سمجھنے کے طریقے بدل گئے۔ ان خلافتی لیڈروں کے لیڈر مولانا محمد علی جوہر تھے اللہ ان کی تربت پر غفران و رحمت کے پھول برسائے، دورِ حاضر کے سیاست کاروں میں وہ ایک فردِ فرید تھے جن کا دل اسلام کی سچی محبت سے معمور تھا، اور جن کا معیار ردّ و قبول اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی کے سوا کچھ نہیں تھا جب تک ان کے ہاتھوں میں زمامِ قیادت رہی، مسلمانوں کی سیاسی گاڑی اگر اسلام کے نصب العین کی طرف نہیں، تو کم از کم اسلامی طرز پر چلتی رہی۔ لیکن یہ تبدیلی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں ترکوں نے نظامِ خلافت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی گل کر دیا۔ اس کے بعد مصطفیٰ کمال (اتاترک) اور امان اللہ خاں کی تجدد نوازیوں سے ہمارے ہاں کے مغرب پرست طبقے کو شہ ملی۔ دوسری طرف علمائے کرام یا تو سیاست سے کوسوں دور چلے گئے تھے یا تحریکِ خلافت کے زمانے سے سیاست میں دخیل ہوئے تو اپنے بنیادی فرائض کو بھی بھول گئے۔ اور پھر یہ کہ میدانِ سیاست کے شعبدہ بازوں میں جو ایک مردِ مومن تھا، وہ دنیا کے غم و آلام سے چھوٹ، ۵۲ سال کی عمر ہی میں اپنے مالک و آقا کی خدمت میں جا حاضر ہوا۔ (۱۹۳۱ء) ؎

خاکِ قدس او را بہ آغوشِ تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت
(اقبالؒ)

اب تک بے عملی تھی، بدعقیدگی نہیں تھی۔ لیکن حالات سازگار پا کر فکری بغاوت نے بھی سر اٹھایا۔ یہ ۱۹۳۵ء کا ذکر ہے۔ اس فکری بغاوت کی علمبرداری لکھنؤ کے رسالۂ نگار کے حصے میں آئی۔ ساتھ ساتھ انکارِ حدیث کا فتنہ بھی نئے لباس میں ظاہر ہوا۔ اس "مولودِ خبیث" کی پرورش بھی ابتداءً نیاز ہی کے نگار خانے میں ہوئی۔ پھر اسے امرتسر میں موافق آب و ہوا نصیب ہوئی اور اس کے بعد دہلی کے ایوانِ حکومت میں اسے مستقل مأمن مل گیا۔ جو اب تقسیم کے بعد پاکستان کے سکرٹریٹ میں منتقل ہو گیا ہے۔ بدقسمتی سے جامعہ ملیہ دہلی کے ایک استاذ (جو ماشاء اللہ خاندانی اہلِ حدیث اور ایک مشہور اہلِ حدیث عالم کی یادگار ہیں) عرصے سے اس کے سرپرست بنے ہوئے ہیں۔ فتنۂ نگار اور فتنۂ انکارِ حدیث کی بیخ کنی کے سلسلے میں جن بزرگوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں اور سالہا سال تک سنّتِ نبوی کے دفاع اور تحفظ کے لیے سینہ سپر رہے، ان میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ممتاز و نمایاں ہیں۔

تحریکِ خلافت کے اثر سے جو مذہبی بیداری پیدا ہوئی تھی، اس کی عمر بہت تھوڑی ثابت ہوئی۔ وہ ایک جذباتی تحریک تھی اور کسی واضح فکر سے محروم۔ اس لیے جوں ہی وہ مخصوص نفسیاتی حالات بدلے، عارضی دینداری بھی ختم ہو گئی اور مذہبی بغاوت کی روح جاگ اٹھی، جیسا کہ ابھی ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

اتنے میں ملک کے سیاسی حالات تیزی کے ساتھ بدلنے لگے۔ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس، جس میں آزادی پسند ہندو اور مسلمان سب جمع تھے دیکھتے دیکھتے ہندو قوم پرستی کی علمبردار بنتی چلی گئی اور اس کے اس رویے سے مسلمانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ ان میں سے ایک گروہ کانگرس کی اس روش کے باوجود اس سے چمٹا رہا اور اس نے متحدہ قومیت کا ایک نیا نظریہ اختیار کر لیا۔ دوسرا گروہ پہلے مسلم کانفرنس اور پھر مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے "مسلم قومیت" کا علمبردار بنا۔ دونوں گروہوں کے درمیان ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ متحدہ قومیت کے ماننے والے ایک بے میل مشترک تہذیب اور مشترک قومیت کے

گن گاتے تھے، جس کے نتیجے میں وطن پرستی کا جذبہ زور پکڑ رہا تھا اور اکبری دور کی ہندوانہ جاہلیت کی طرف مسلمانوں کے پھر پلٹ جانے کی راہ ہموار ہو رہی تھی۔ دوسری طرف مسلم قومیت کے علم بردار مسلم تہذیب اور مسلم نسل و قومیت کی بنیاد پر ایک نئی تحریک اٹھا رہے تھے، جس میں بظاہر تو اسلام سے وابستگی کا ایک خوشگوار رجحان پایا جاتا تھا، مگر اس کی رفتار صاف بتا رہی تھی کہ یہ تحریک اسلام کی آئیڈیالوجی کی طرف جانے کے بجائے تیزی کے ساتھ ٹرکی، ایران اور مصر کی طرح محض ایک آزاد مسلم قوم وجود میں لانے کی طرف جا رہی ہے۔ وطن پرستی اور مسلم قوم پرستی کی یہ کشمکش دن بدن بڑھتی چلی گئی اور مسلمانوں کی وحدت کا شیرازہ منتشر ہونے لگا۔ اس سلسلے کی سب سے بڑی ٹریجیڈی یہ ہے کہ عالمانِ دین کی نمائندہ "جمعیت" نیشنل کانگرس اور اس کی پالیسی کے پر جوش ہم نواؤں میں شامل ہو گئی اور شدت کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم رہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم قومیت کی نوخیز تحریک، جس کی لیڈرشپ میں دین کے علم اور دینی رجحانات کی پہلے ہی بہت کمی تھی، علماء سے برسرِ جنگ ہو گئی اور اس چیز نے صرف علماء ہی کا استخفاف نہیں کرایا۔ بلکہ ان کے ساتھ علم دین اور دین کے اثر کو بھی سخت نقصان پہنچایا۔

وطن پرستی اور مسلم قوم پرستی کی یہ آویزش جانے کہاں جا کر دم لیتی، اگر اس کے خلاف اسلام اور دین حق کی بے لاگ آواز بلند نہ ہو جاتی۔ ایک دردمند صاحب علم نے آنے والے حالات کا بروقت اندازہ لگا لیا تھا، اور ۱۹۳۳ء میں حیدر آباد دکن سے رسالہ ترجمان القرآن جاری کر کے دعوت حق کے لیے ذہن ہموار کرنا شروع کر دی تھی۔ ابتدائی چار پانچ سال افکار و خیالات کی تنقیح اور اسلامی فکر و دین کے متعلق گوناگوں غلط فہمیوں کے ازالے میں صرف ہوئے۔ ابھی یہ تنقید و تنقیح کا کام جاری تھا کہ ۳۸-۱۹۳۷ء میں ہندوستانی وطن پرستی اور مسلم قوم پرستی کی کشمکش طوفانی شکل اختیار کرنے لگی اور وقت آگیا کہ اسلام کی سچی اور بے میل دعوت ایک مرتبہ پھر دنیا کے سامنے پیش کر دی جائے۔ اس موقع پر مدیر "ترجمان" نے پہلے ہندوستانی وطن پرستی کی بیخ کنی ضروری سمجھی اور آج صرف موافق ہی نہیں، مخالف بھی یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ اگر ترجمان القرآن

کے بے پناہ مقالات نہ ہوتے تو متحدہ قومیت کا جنازہ نکلنا آسان نہ تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستانی قومیت کے خلاف ترجمان القرآن کے مسلسل حملوں سے مسلم لیگ اور مسلم قومیت کی تحریک کو بڑی تقویت پہنچی اور ان مضامین کو گھر گھر پھیلانے میں لیگی حضرات نے پورا تعاون کیا۔ مگر جوں ہی اس مہم کی دوسری منزل سامنے آئی اور مدیر ترجمان القرآن نے مسلم قومیت کی کمزوریاں اور اس کے علم برداروں کی بے اعتدالیاں دکھانا شروع کیں اور اسلام کی راہ راست سے ان کا انحراف، عام مسلمانوں پر واضح کیا، تو پھر اس غریب سے زیادہ بُرا کوئی نہ تھا گویا اسلام سے محبت نہیں، اپنی قومیت اور عادات و رسم و رواج زیادہ محبوب ہیں۔ جب تک شرک خالص کی مذمت کی جائے سبحان اللہ اور ماشاء اللہ کے نعرے بلند ہوں، اور جہاں ان جاہلی رسوم اور عادات کی نشان دہی کی جائے جو اسلامی سوسائٹی میں راہ پاگئی ہیں، تو جبینِ ناز پر شکنیں پڑ پڑ جائیں۔ یہ طالبانِ حق کا شیوہ نہیں، یہ تو بگڑی ہوئی قوموں کے لچھن ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مدیر ترجمان القرآن نے ہندوستانی قومیت کی بیخ کنی سے فارغ ہوتے ہی فوراً اپنی کوششوں کا رُخ صاف اور بے لاگ اسلام کی دعوت کی طرف موڑ دیا، تاکہ مسلم قومیت کی تحریک کو اتاترکی اور رضا شاہی کی طرف جانے سے روکا جائے اور مسلمانوں میں زندگی کی جو نئی حرکت پیدا ہوئی ہے، اُسے اقامت دین کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ یہ کوئی نئی دعوت نہ تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سید المرسلین و خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاءؑ اسی کی دعوت دیتے آئے ہیں اور ان کے بعد امت کے تمام مصلحین کے پیشِ نظر یہی چیز رہی ہے۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ اسلام کی بے لاگ دعوت کا خود اس کے دم بھرنے والوں نے کبھی ٹھنڈے دل سے استقبال نہیں کیا ہے۔ یہ کل کا واقعہ ہے، اور آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے یہ نیرنگیاں ظہور میں آرہی ہیں۔ اس لیے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں

سنہ ۳۹ء سے سنہ ۴۱ء تک مدیر ترجمان القرآن انفرادی طور پر اللہ کے دین کی طرف

بلاتے رہے اور اقامتِ دین کی منظم جدوجہد کے لیے لوگوں کو آمادۂ عمل کرتے رہے۔ جن نیک اور باہمت بندوں نے پہلے پہل اس دعوت کا خیر مقدم کیا اور صدائے لبیک بلند کی، انہوں نے ۱۹۴۱ء میں اپنے کو ایک "اسلامی جماعت" کی صورت میں منظم کر لیا۔ اور مدیر ترجمان القرآن بالاتفاق اس کے امیر منتخب ہوئے۔

۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلسل جدوجہد اور دعوت کی سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔ صحیح معنوں میں ہندوستان کی تاریخ میں یہ دوسری اسلامی تحریک تھی جو صحیح لائنوں پر شروع کی گئی۔ اس کے نصب العین، طریق کار اور پروگرام پر خاصہ لٹریچر موجود ہے جسے پڑھ کر اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اس جماعت نے پوری کوشش کی کہ مسلمان اقامتِ دین کے نصب العین پر جمع ہو جائیں، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ مسلم قوم پرستی اور ہندو وطن پرستی کی کشمکش اپنی راہ پر بڑھتی رہی اور اس کا انجام برصغیر ہند کے اندر دو نئے ملکوں کی پیدائش میں رونما ہوا۔ ایک بھارت جہاں سیاسی اقتدار مکمل طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں چلا گیا اور وہاں کے مسلمان پوری طرح مغلوب ہو گئے۔ دوسرے پاکستان جہاں سیاسی اقتدار مکمل طور پر مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گیا اور سابق ہندوستانی مسلم قوم کے نصف سے کچھ زائد حصے کو یہ اختیارات حاصل ہو گئے کہ اگر وہ اسلام کو زندہ کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔ اس تقسیم کے بعد اسلامی تحریک کی علم بردار جماعت بھی تقسیم ہو گئی۔ اس کے جو کارکن تقسیم کے وقت بھارت میں تھے، وہ ایک الگ جماعت بن گئے، اور آج جس تن دہی اور ثابت قدمی کے ساتھ انتہائی نامساعد حالات میں وہ دعوتِ حق کا فرض انجام دے رہے ہیں، وہ ہم پاکستانی مسلمانوں کے لیے قابلِ رشک ہے۔ اللہ کی شان کہ جو علمائے دین بڑے بڑے آستانوں کے مسند نشین ہیں، ان کی آنکھیں تو متحدہ قومیت کے بدترین نتائج دیکھنے اور بھگت لینے کے بعد بھی نہ کھلیں، بلکہ وہ اس سے بھی بڑھ کر ایک شدید تر ضلالت، یعنی لادینی (سیکولرزم) کے حامی بن گئے، مگر جن لوگوں کے سر کسی دار العلوم

کی دستارِ فضیلت سے مزین نہیں ہیں، وہ آج بھی سرزمینِ ہند میں وطن پرستی اور سیکولرزم کی تردید کر رہے ہیں اور نظامِ حق کے قیام کی دعوت دیئے جا رہے ہیں۔ پھر اس سے بھی زیادہ ستم ظریفی یہ ہے کہ دینی آستانوں کے مسند نشینوں کو ان سرفروش بندگانِ حق کی جرأتیں دیکھ کر شرم تو کیا آتی، وہ آج اُلٹے اس بات پر تُلے ہوئے ہیں کہ اُس ایک آواز کو بھی بند کر دیں جو بھارت میں حق کے لیے بلند ہو رہی ہے۔ کیونکہ اس کے بلند ہونے سے انہیں اپنی مذہبی ساکھ کے گرجانے کا اندیشہ ہے۔ تاریخ میں یہ عجوبہ بھی یادگار رہے گا۔ کہ متحدہ قومیت اور لادینی جمہوریت کے علمبردار تو قرار پاتے ہیں ٹکسالی مسلمان، اور ان کے دارالافتاؤں سے گمراہی اور بے دینی کے فتوے جاری ہو رہے ہیں اُن لوگوں کے حق میں جو آج اِس انتہائی خطرناک دور میں بھی بھارت کی مسلم اور غیر مسلم آبادی کو اسلامی نظامِ زندگی کی طرف دعوت دینے سے نہیں چوکتے۔

یہ تو ہے بھارت کی اسلامی تحریک کا حال۔ رہا پاکستان، تو یہاں تقسیم کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کے نام سے ایک الگ نظام جماعت بن گیا۔ اور اس نے حال و مقام کی مناسبت سے ایک دوسرا پروگرام اختیار کیا۔ یہاں ایک مسلم قوم آباد ہے اور اسے حاکمانہ اختیارات حاصل ہیں اس لیے یہاں کی جماعت نے تقسیم کے بعد تارکانِ وطن اور پناہ گزینوں کی امداد و خدمت کے کام سے فارغ ہوتے ہی مطالبۂ نظامِ اسلامی کی مہم شروع کر دی، جو اربابِ اقتدار کی تمام ناراضگیوں کے باوجود جاری رہی اور آخر اس مطالبہ کی مہم نے انہیں قراردادِ مقاصد پاس کرنے پر مجبور کیا، جو اصل میں اس ریاست کے مسلمان ہونے کا باضابطہ اعلان تھا۔

قراردادِ مقاصد کے بعد جماعت کا کام دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک طرف وہ عام دعوت اور منظم تبلیغ و تلقین سے معاشرے کی ذہنی و اخلاقی اصلاح کرنے میں لگی ہوئی ہے، تاکہ اسلامی قانون کے نفاذ و اجراء کے لیے مناسب و موزوں فضا تیار ہو۔ دوسری طرف وہ قراردادِ مقاصد کے منشاء کے مطابق نظامِ حکومت کی اصلاح کے لیے کوشش کر رہی ہے، تاکہ حکومت کا دستور بھی اسلامی ہو اور ملک کا قانون بھی اسلامی۔ اور پھر اس پر عملدرآمد کرنے کے لیے ایسے لوگ ملک میں برسرِ اقتدار

آئیں جن کی ذہنیت اور سیرت بھی اسلامی ہو۔ اس کام میں جو طبقے جماعت اسلامی کی مزاحمت کر رہے ہیں، ان میں سے مغرب زدہ طبقے کی مزاحمت ہماری سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ اسلامی نظام کا قیام ان کے ملحدانہ نظریات اور ان کی فاسقانہ عادات کے خلاف ہے۔ اشتراکی گروہ کی مزاحمت بھی ہماری سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ جہاں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ جاری ہوگا، وہاں مارکس اور لینن کا طریقہ جاری نہ ہو سکے گا۔ گمراہ فرقوں کی مزاحمت بھی ہماری سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ اس کے فروغ کا امکان اُسی وقت تک ہے جب تک یہاں کتاب و سنت سے بے نیاز ہو کر کام کرنے والی ایک فاسق قیادت موجود ہے۔ لیکن اگر کوئی مزاحمت ہماری سمجھ میں نہیں آتی تو وہ اُن علماء کرام کی مزاحمت ہے جو خود کہتے ہیں کہ شریعت کی فرمانروائی انہیں مطلوب ہے، خود کہتے ہیں کہ فسق و فجور کا یہ طوفان انہیں گوارا نہیں ہے، مگر جب اسی مقصد کے لیے جماعت اسلامی آگے بڑھ کر جدوجہد کرتی ہے تو وہ ہر ممکن طریقہ سے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی ساری ہمدردیاں اُس فاسق قیادت کے ساتھ ہوتی ہیں جو یہاں اس وقت ہر ضلالت اور ہر فسق کی پشت پناہ بنی ہوئی ہے۔ اس طرزِ عمل کی وجہ کیا ہے؟ یہ سوال ہم سے اکثر پوچھا جاتا ہے۔ مگر ہمیں اس کا کوئی جواب معلوم نہیں ہے۔ شاید یہ راز اس دنیا میں راز ہی رہے گا، مگر ایک دن بہرحال آتا ہے جس میں سارے ہی رازوں سے پردہ اُٹھ جائے گا۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ ؕ

• امن عالم کا ضامن • فلاح انسانیت کا پیغامبر • پورے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا واحد اخبار

سہ روزہ **الانصاف** الہ آباد
یو پی - بھارت

الانصاف آپ کا بہترین رفیق ثابت ہوگا۔ خود پڑھیے دوسروں کو پڑھوائیے۔

زرِ تعاون سالانہ ۱۲ روپے ششماہی ۶ روپے، سہ ماہی ۳ روپے۔ پتہ۔ دفتر الانصاف ۳۵ شاہ گنج الہ آباد یو پی بھارت